بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نظرات

چند سال پہلے ترکی میں جو فوجی انقلاب ہوا اور برسر اقتدار ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت کو تشدد کے ذریعہ برطرف کرکے اس کے بعض لیڈروں کو پھانسیاں دی گئیں، تو اس کا ایک بڑا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ پارٹی مذکور کے رہنماؤں کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ اتاترک کی سیکولرزم کی جگہ جذباتی قسم کی مذہبیت لا رہے تھے اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ اس کی وجہ سے کہیں وہ نظریاتی اور آئینی اساس ہی ختم نہ ہو جائے، جس پر ترکی کی جدید کمالی ریاست کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

ڈیموکریٹک پارٹی کو تشدّد کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد کچھ مدت کے لئے ری پبلکن پارٹی جو کمالیت کے اصول و مبادی کی علم بردار رہی ہے، برسر اقتدار آگئی، لیکن حالیہ انتخابات میں جسٹس پارٹی نے جو ایک لحاظ سے ڈیموکریٹک پارٹی ہی کی وارث ہے، ری پبلکن پارٹی کو شکست دی ہے اور آجکل ترکی میں اسی کی حکومت ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جسٹس پارٹی کو ری پبلکن پارٹی کے مقابلے میں اس لئے کامیابی ہوئی کہ ترک عوام کے نزدیک اس کا رجحان مذہب کی طرف ہے اور وہ ری پبلکن پارٹی کی طرح مغرب پرست نہیں۔ ترکی کی دیہاتی آبادی سے ووٹ لینے کے لئے مذہب کی اپیل اب بھی کارگر ہے اور ڈیموکریٹک پارٹی کی طرح جسٹس پارٹی نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔

ترکوں کی سیاسی زندگی کے یہ نشیب و فراز بتاتے ہیں کہ ان کے ہاں اگر اس وقت مذہبی بحران کی صورت نہیں تو ان کے مختلف طبقوں میں مذہبی کھچاؤ ضرور ہے، اور اس کا اثر ان کی حزبی سیاس پر بھی پڑ رہا ہے۔ ہمارے خیال میں مسلمان ملکوں میں ترکی شاید واحد ملک ہے، جہاں سیاسی و حکو سطح پر اس طرح کی صورت حال ہے۔ ترکی میں سیکولر کمالی نظام کو نافذ ہوئے چالیس سال سے

عرصہ ہوگیا ہے لیکن اب بھی ترک عوام کی اکثریت اسے اپنا نہیں پائی۔ چنانچہ جہاں ایک طرف مغربی تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو کمالیت کا حامی ہے، وہاں دوسری طرف ترک دیہاتی آبادی ہے۔ جس کی اکثریت مذہبی اعتبار سے اُسی ذہنی وجذباتی ماحول میں زندگی گزارتی ہے، جو اتاترک کی انقلابی اصلاحات سے پہلے تھا۔ ڈیموکریٹک پارٹی اور فوجی قیادت کا تصادم اسی اندرونی کشمکش کا نتیجہ تھا۔

حال ہی میں مشہور انگریزی رسالہ "مسلم ورلڈ" میں ترکوں کی موجودہ مذہبی صورت حال پر ایک مضمون چھپا ہے، جسے اُردو کے بعض دینی رسائل نے بھی نقل کیا ہے۔ مضمون میں لکھا ہے:۔ "۱۹۲۴ء میں جب خلافت کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا گیا تو تمام دینی مدارس کو وزارت تعلیم کے سپرد کر دیا گیا، جس نے ان کو فوراً بند کر دیا اور مستقبل کے اماموں اور خطیبوں کے لئے نئے مدرسے کھول لے گئے۔ استنبول یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات قائم کیا گیا، لیکن اتاترک کا فیصلہ تھا کہ مذہب کو سیاست سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ مذہب اعلیٰ طبقوں میں معتوب ہوچکا تھا اور نئی نسل مغربی تہذیب کی گرویدہ تھی۔ اس لئے شعبۂ دینیات مقبول نہ ہوسکا۔ ۱۹۳۳ء میں اس کے طلبہ کی تعداد صفر کے برابر ہوگئی اور ۱۹۴۰ء تک دین کی رہنمائی جاہلوں اور نیم ملاؤں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ..."

اسی مضمون میں لکھا ہے:۔ ۱۹۶۲ء میں ترکی کی وزارت داخلہ نے اماموں اور خطیبوں کی تعلیم کے بارے میں اعداد وشمار جمع کرائے، ان سے پتہ چلا کہ ساٹھ ہزار مذہبی پیشواؤں میں سے کُل ۵۱۹۱ صرف ابتدائی تعلیم حاصل کئے ہوئے ہیں۔

ترک ایک مسلمان قوم ہیں اور بحیثیت مسلمان قوم کے ان کی بڑی شاندار طویل تاریخ ہے جس کے کارناموں کی یادیں ترکوں کی اجتماعی وانفرادی زندگی میں رچی بسی ہوئی ہیں، اور ان سے ان کے ہاں وہ روحانی، اخلاقی اور نفسی سرچشمے پھوٹتے ہیں، جو ترکوں کو بلحاظ ایک قوم کے زندگی کی معنویت اور تازگی بخشتے ہیں۔ آپ ان سرچشموں کو تو بند کرنے سے رہے، کیونکہ وہ صدیوں کی تاریخ کا حتمی تسلسل ہیں۔ اور یہ تسلسل اوامر واحکام سے ختم نہیں ہوا کرتا، یہ سرچشمے ترکی قوم کے باطن میں پھوٹتے رہے، اور انہیں پھوٹتے رہنا چاہیئے تھا، لیکن ان کو اس رخ پر موڑنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی، جہاں نئی نسلیں اپنے دلوں کی کھیتیوں کو سرسبز کرنے کے لئے ان کی محتاج تھیں۔ ان باطنی سرچشموں کو اسی طرح بہنے دیا گیا اور ان سے وہی طبقے سیراب ہوتے رہے

جن کے زور کو کم کرنا کمالی انقلاب کا مقصد اوّلیں تھا۔

ترک قوم کی زندگی میں مذہب اسلام ایک بڑا مؤثر اور فعال عنصر رہا ہے اور ترک قوم کی خاص کر وہ جو عثمانی ترکوں کی آج وارث ہے، تمام تر عظمت اسلام ہی کی رہین احسان ہے۔ سیکولر آئین کے تحت مذہب کو سیاست سے الگ کر کے یہ سمجھ لینا کہ اس طرح ترکوں کی قومی زندگی میں اسلام کی اثر آفرینی اور فعالیت ختم ہو جائے گی، بہت بڑی بھول تھی اور ترکی میں اس وقت جو مذہبی کھچاؤ ہے، وہ اسی کا نتیجہ ہے عثمانی خلافت کے ختم ہونے کے بعد مصطفیٰ کمال اتاترک نے جن حالات میں ترکی کی عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لی تھی، ان کا تقاضا تھا کہ وہ اسی طرح کی دُور رس اور انقلابی اصلاحات کرتے، جیسی انھوں نے اس وقت کیں۔ واقعی اس وقت ضرورت تھی کہ خانقاہیں، دینی مدارس، مشیختیں اور ان سے متعلقہ ادارے ختم کر دیئے جاتے اور نئی ترکی کی تعمیر نئی بنیادوں پر شروع ہوتی، لیکن غلطی یہ ہوئی کہ سیکولرزم کے زیر اثر مذہبی تعلیم کو نظرانداز کر دیا گیا، اور مذہب کا میدان تمام کا تمام ان مذہبی طبقوں کے لئے خالی چھوڑ دیا گیا، جو پرانی لکیر کے فقیر تھے اور ترکی کی نئی زندگی اور اُس کی ضرورتوں سے بالکل بے خبر تھے۔ اس کی وجہ سے ہوا یہ کہ رجعت پرستی اور مضبوط ہو گئی، اور ترکی دیہات اس کے گڑھ بن گئے۔

اب حالت یہ ہے کہ مغربی تعلیم پائی ہوئی نئی نسل کی اکثریت مغربیت کی دلدادہ ہے، اور وہ مذہبی تعلیم، مذہبی روایات اور مذہب کی معنوی اور اخلاقی قدروں سے ناواقف رکھی گئی ہے، اور دوسری طرف عام آبادی جس مذہب کو مانتی ہے، اور جس کا اس پر اثر ہے، وہ اپنے معتقدات، شعائر و آداب اور روایات و خیالات میں اس دَور سے تعلق رکھتا ہے، جو ختم ہو گیا، اور اس کے آثار بتدریج مٹتے جا رہے ہیں۔ مثلاً اسی مضمون میں جس کا اوپر ذکر ہوا، لکھا ہے۔ ایک مدرس پر لوگوں نے اس لئے حملہ کر دیا کہ اس نے کہا تھا کہ گاؤں کے لوگ تعلیم سے زیادہ مذہب کا خیال کرتے ہیں، ایک شخص نے اپنے بچے کی موت کو علاج پر اس لئے ترجیح دی کہ وہ رمضان المبارک میں بیمار تھا۔

اس کے برعکس ترکی پارلیمنٹ کے ایک رکن نے ۲۳۔ اپریل ۱۹۶۳ء کو روزنامہ "ملیت" میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ زائرین کعبہ نے ۵۵ لاکھ ڈالر کی جو رقم حج پر صرف کی، اس سے پندرہ ہزار گاؤں میں سے جہاں کوئی مدرسہ نہیں ہے، ۲۷۵۰ مدرسے قائم ہو سکتے تھے۔

یہ افراط و تفریط سب اس لئے ہے کہ ترک ایک مدّت سے معقول دینی تعلیم سے محروم رہے ہیں اور گو وہاں کا آئین سیکولر ہے اور حکومت کے رنگ ڈھنگ سب کے سب مغربی ہیں، لیکن عوام کو مذہبی لحاظ سے انہیں عناصر کے زیر اثر رہنے دیا گیا ہے، جو پہلے سے چلے آتے ہیں، اور انہیں نئی تعلیم و تربیّت دینے کی مطلق کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ در آں حالیکہ مذہب ترکوں کی قومی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے اور ایک قومی حکومت کو اسے صحیح معنوں میں قوم کے لئے ایک اخلاقی و اجتماعی قوت بنانے میں غفلت نہیں کرنی چاہیئے تھی

ترکی میں آجکل مذہبی زندگی کے اس کھچاؤ کو دُور کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اور ایک لحاظ سے موجودہ حکمران جسٹس پارٹی ڈیموکریٹک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان ایک راہ اعتدال ہے کیا سیکولر آئین کو برقرار رکھتے ہوئے بھی مذہبی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے، اور امید ہے اس سلسلے میں ترکی میں ضروری اقدامات کئے جائیں گے۔

خوش قسمتی سے اور بہت حد تک ان تاریخی مراحل کی بدولت جن سے گزشتہ دو سو سال میں اس سرزمین کے مسلمانوں کو گزرنا پڑا ہے۔ یہاں سیاسی اور حکومتی سطح پر اس پیمانے کا مذہبی کھچاؤ نہیں، جس سے پچھلے سالوں میں ترکوں کو سامنا کرنا پڑا ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد جب کہ ہماری زرعی معیشت کی جگہ صنعتی معیشت لے رہی ہے اور ملک کے طول و عرض میں بڑی کثرت سے کارخانے لگ رہے ہیں، اور ان کی وجہ سے ان سالوں میں معاشرتی زندگی اور اس کے نقطۂ نظر میں بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں، اور آئندہ اور زیادہ ہوں گی، تو اس امر کا امکان پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں ہمارے ہاں بھی آبادی دو متحارب اور متضاد طبقوں میں نہ بٹ جائے۔ یعنی دور رس اور ہمہ گیر معاشی اور اجتماعی تبدیلیوں کی وجہ سے ایک طبقہ تو بالکل "ماڈرن" ہو جائے، اور دوسرا انہیں راہوں پر چلتا رہے، جو اسے آخر میں اس منزل پر لے جائیں، جہاں جدید طبقے سے اس کا تصادم ناگزیر ہو جائے، یہ خطرہ یہاں بھی موجود ہے، گو اس سنگین حد تک نہیں جس کا مظاہرہ ترکی میں ہوا۔

پاکستان کو اگر استحکام حاصل کرنا، اور ہمہ جہتی ترقی کرنا ہے، تو اس کے لئے لازم ہے کہ اس میں سائنسی تعلیم اور ٹیکنالوجی کو فروغ ہو، معیشت بدلے، معاشرت بدلے، زندگی کے ہر پہلو کی تنظیم اور منصوبہ بندی ہو۔ ملک کے قدرتی وسائل کو ترقی دی جائے اور وقت کا ضیاع اور انفرادی و اجتماعی صلاحیتوں کا ضیاع

جو آجکل ہوتا ہے، اسے ناممکن بنا دیا جائے، اور پوری قوم زندگی کو بنانے، سنوارنے اور اس کے اسباب معیشت کو زیادہ سے زیادہ فیض رساں بنانے میں لگ جائے۔ یہ ضروری ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، لیکن بدقسمتی سے اور بہت سی رکاوٹوں کے علاوہ جو ملک و قوم کو آگے لے جانے والی راہ میں حائل ہیں، ایک بڑی رکاوٹ ہمارے ہاں کے وہ دینی مدارس ہیں، جن کا جال ملک کے ہر حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ ان مدارس کی تعلیم، ان کا نصاب، ان کا ماحول اور ان کا تربیتی نظام، ان میں تعلیم پانے والے ہزاروں لاکھوں افراد کو اس راہ پر ڈال رہا ہے، جو اُس راہ کی بالکل ضد ہے، جس پر ہماری حکومت، ہماری معیشت، ہماری نئی تعلیم اور ہمارا اجتماع گامزن ہے۔ اب اگر آپ موٹر کار کو بیک وقت آگے کو بھی چلاتے ہیں، اور ساتھ ہی "ریورس گیئر" بھی لگاتے ہیں، تو اس سے لامحالہ دھچکے لگیں گے۔ سائنسی تعلیم، ٹیکنالوجی اور جدید معیشت اور صنعت ہمیں آگے کو دھکیل رہی ہے، اور پرانے دینی مدرسوں کا نظام پیچھے کو لے جا رہا ہے۔ یہ کشاکش خطرناک ہے اور اس کا مداوا ہونا چاہیئے۔

۱۹۲۴ء کے بعد ترکی میں جو کچھ ہوا، اس میں ہمارے لئے بڑا سبق ہے۔ حکومت کا قوم کی مذہبی زندگی اور اس کی جملہ انفرادی و اجتماعی سرگرمیوں سے، جبکہ وہ قوم مسلمان ہو، جس کی پوری تاریخ میں سیاست اور مذہب کے درمیان کبھی واضح خط فصل نہ کھینچا گیا ہو، بے تعلق ہو جانا اور انہیں ایسے مذہبی پیشواؤں کی جاگیر بنا دینا، جو ابتدائی تعلیم تک سے بے بہرہ ہوں، قوم و ملک کے لئے بڑا خطرناک ہے۔ اتاترک اور ان کے جانشینوں نے یہی غلطی کی، اور اس کا خمیازہ بعد والوں کو بھگتنا پڑا۔ قدیم و جدید دو متخاصم گروہ ہو گئے اور ان میں آپس میں چل گئی۔

یہ بڑی اچھی بات ہے کہ ہمارے ہاں مذہبی تعلیم تمام سرکاری درسگاہوں کے نصاب میں داخل ہے اور یونیورسٹیوں میں دینیات کے باقاعدہ شعبے کھل گئے ہیں۔ یقیناً اس طرح نئی تعلیم گاہوں کے فارغ التحصیل اسلام کے اصول و مبادی سے ناواقف نہیں رہیں گے اور نئی پود نئے علوم کے ساتھ ساتھ اسلام کی ضروری تعلیمات کی بھی تحصیل کر سکے گی، لیکن ایک بہت بڑا مسئلہ ان ہزارہا دینی مدرسوں کا رہ جاتا ہے جو ایک طرف ایسی دینی تعلیم دیتے ہیں، جس کا اس زمانے میں عام طور سے کوئی مصرف نہیں، اور دوسرے اس سے زیادہ تر وہ فضا پیدا ہوتی ہے، جس میں اصلاح و ترقی کی کوششوں کے خلاف رجحانات

ابھرتے ہیں اور فرقہ وارانہ تعصبات پرورش پاتے ہیں۔ بے شک ملک میں خال خال ایسے دینی مراکز بھی ہیں، جن کی حیثیت اس ضمن میں مستثنیات کی ہے اور جہاں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ میٹرک تک جدید تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے دینی مراکز کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ ان ہزار ہا ہزار دینی مدارس کو کس طرح اس قابل بنایا جائے کہ ان میں تعلیم پانے والے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ کم سے کم اتنی دنیوی تعلیم بھی حاصل کر سکیں کہ وہ معاشرے کے مفید ارکان بن سکیں اور ان سے جہاں عام آبادی کی دینی ضرورتیں پوری ہوں، وہاں وہ ملک کی معاشی اور ترقیاتی زندگی میں بھی حصہ لیں۔ اور یوں بھی جب دنیوی اور جدید تعلیم کے مدارس میں حکومت نے لازمی طور سے دینی تعلیم کا انتظام کیا ہے تو کیوں نہ دینی مدارس میں دنیوی تعلیم کا حکماً انتظام ہو۔ دینی مدارس سے ہزار ہا ہزار کی تعداد میں فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کا محض ایسی خدمات کے لئے وقف ہو جانا، جو اُن کے نزدیک دینی ہیں اور ان کے علاوہ اور کوئی کام نہ کرنا، معاشرہ پر ایک ایسا اقتصادی بار ہے کہ اس کے ہوتے ہماری معاشی ترقی اور عام بہبود مشکل ہے۔ دینی مدارس اگر تھوڑی سی اصلاح قبول کرلیں اور اپنے نصاب میں قومی و علاقائی زبان کی تعلیم اور ابتدائی حساب، تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کے مضامین داخل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو ایک مختصر مدت میں عوام کی زندگی میں بڑی خوشگوار تبدیلی آسکتی ہے کیونکہ موجودہ دینی مدارس سے اور خاص کر اُن سے جو دیہات میں ہیں، کم سے کم خرچ سے قوم کی زیادہ سے زیادہ نسبتاً غریب آبادی کو مفید تعلیم دی جاسکتی ہے۔

یہ کیسے ہو؟ اس پر خاص طور سے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک بڑے بڑے دینی مدارس کا تعلق ہے، جن کی کہ ہزاروں اور لاکھوں کی سالانہ آمدنیاں ہیں، ان کو کسی تنظیم کے تحت لانا چنداں مشکل نہیں، اس بارے میں حکومت بڑی آسانی سے ان کے حسابات اور آمد و خرچ پر کنٹرول کرنے کا قانون بنا سکتی ہے۔ آخر یہ مدارس قومی عطیات سے چلتے ہیں اور ایک قومی حکومت ایسے عطیات کی جانچ پڑتال کرنے کا پورا حق رکھتی ہے۔ اب رہے چھوٹے دینی مدارس اور مکتب۔ اگر ان میں اور بنیادی جمہوریتوں کے نظام میں تعاون کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو بڑا مفید رہے گا۔ ان مدارس اور مکاتب کو دیہاتی سطح پر ضروری امداد دی جائے اور اس طرح ان سے دیہات پس ماندہ علاقوں میں تعلیم کو عام کرنے کا کام لیا جائے۔

بڑے بڑے دینی مدارس کے انتظام و انصرام کی طرف تو فوری توجہ ہونی چاہیئے۔ اگر یہ تھوڑا بہت کنٹرول اور نصاب کی معمولی سی اصلاح قبول کرلیں، تو خود مذہبی طبقوں میں جو باہمی تنافر و تخاصم پایا جاتا ہے

وہ خاصہ کم ہو جائے اور دوسرے ہر ضروری معاشرتی اصلاح کے خلاف علمائے کرام کی طرف سے آئے دن جو مہیں چلتی ہیں، یہ نہ چلیں، اور مذہبی کھچاؤ کی فضا مائل بہ سکون ہو جائے۔

ان دنوں شام کے مفتی اعظم شیخ احمد کفتارو صدر مملکت محمد ایوب خان سے ملنے تشریف لائے تھے۔ شیخ موصوف ایک روشن خیال اور موجودہ زمانے کی ضرورتوں کا صحیح شعور رکھنے والے عالم دین ہیں۔ صدر ایوب نے انہیں "ستارۂ پاکستان" کا نشان دیتے ہوئے جہاں گزشتہ جون کی جنگ میں عربوں کی پسپائی پر گہرے رنج والم کا اظہار کیا، وہاں اس بات پر بھی زور دیا کہ جب تک مسلمان اقتصادی، سیاسی اور فوجی اعتبار سے مضبوط نہیں ہوں گے، وہ کسی روشن مستقبل کا تصوّر نہیں کر سکتے۔

عرب بالخصوص اور عام مسلمان بالعموم ان چیزوں میں اس لئے پیچھے رہ گئے کہ وہ اپنے دین کے اصل مغز کو چھوڑ کر اس کے چھلکوں کے پیچھے پڑ گئے اور انھوں نے دین کی روح کے بجائے ظواہر پرستی کو دین سمجھ لیا۔ صدر ایوب نے شام کے مفتی اعظم سے دوران گفت گو میں اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ اسلام کی صحیح روح اور حکمت دین کو نظر انداز کر کے خالی خولی عقیدوں کو منوانے پر زور دیا جاتا ہے۔ علماء کو چاہیئے کہ وہ روح اسلام کو نئی زندگی بخشنے اور اسلام کی بنیادی حکمت اور اصولوں کی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی روشنی میں تعبیر و تشریح کرنے کے لئے مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنا کر نہ صرف ہم مضبوط ہو سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں، بلکہ ہمارا قومی وجود بھی صرف اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔ نیز سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنائے بغیر اقتصادی، سیاسی اور فوجی اعتبار سے مضبوط ہونا ایک ایسا خواب ہے، جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ ہمیں لازماً مضبوط ہونا ہے اور اس کے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ اب ہمارے علماء کرام کا یہ فرض ہے کہ وہ دین اسلام کے اساسی عقائد اور اس کے اصول و مبادی کو آج کے مسلمانوں کے سامنے اس طرح پیش کریں، اور ان کی ایسی تشریح و تعبیر کریں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے لوازم اور نتائج اور ان میں کوئی تضاد نہ ہو، اور مسلمان روحاً و عملاً اور ذہناً اور جذباتی طور پر مسلمان رہتے ہوئے سائنس اور ٹیکنالوجی کو ایسے اپنائیں، اور ان میں اس طرح آگے بڑھیں، جیسے وہ اپنے عہد اقبال میں صدیوں تک آگے رہے ہیں۔

یہ کام مشکل تو ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں، البتہ اس کے لئے علماء کو روح عصر کے تقاضوں کو سمجھنا اور انسے اپنے ذہنوں میں بار دینا پڑے گا۔ اس کے بغیر یہ کام ہونے کا نہیں۔ خدا کرے علماء کا کوئی گروہ آگے بڑھے، اور ملّت اسلامیہ کی اس اہم اور فوری ضرورت کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھائے۔